شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی وعرفانی مقام

جناب محمد ظفر اقبال

(پہلی قسط)

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اتنی ہمہ جہات اور متنوع اوصاف وکمالات سے مملو ہے کہ اگر ان کی بابرکت زندگی کے کسی ایک ہی گوشے کو موضوع بنا کر اس پر لکھا جائے تو مختلف عنوانات پر ایک ایک بسیط مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔ اس حقیقت کے برعکس یہ بات بھی بہت قابل مشاہدہ ہے کہ آزادئ ہند کی مختلف تحریکات میں قائدانہ اور جاں فروشانہ شمولیت نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت کو جہاد، سیاسیات اور تحریکات میں قیادت کا استعارہ بنا دیا ہے۔ بلاشبہہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی میدانِ جہاد وتحریکات میں خدمات اس لائق ہیں کہ منصب امامت اور نقش ہدایت کے لیے برعظیم میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اگر کسی شخصیت کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ بجا طور پر صرف شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جہاں اس تکرار و گردان اور تحقیق وتفتیش نے میدان جہاد، تحریکات، زندان واسیری کے ایام میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی حیات کے تقریباً ہر گوشے کو منظر عام پر لا کر اس باب میں اتباع کی بڑی راہ فراہم کی ہے اور اخلاف کو سلف کے طریق جہاد وسیاست کی ایک محفوظ راہ دکھائی ہے، وہیں اس عمل اور رویّے سے لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے بہت سے باطنی، احسانی، عرفانی، اخلاقی، سماجی اور تعلیمی پہلو نظر انداز ہوگئے ہیں، یا اس طرح واضح ہوکر منصۂ شہود پر نہیں آسکے کہ ان سے بلا تحقیق وتفحص رہ نمائی لی جاسکے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر شیخ الہندؒ کی زندگی کا بہ نظرِ امعان مطالعہ کیا جائے تو آپؒ کی شخصیت علم و فضل، درس و تدریس، افتا وتصنیف، مناظرے و وعظ اور سلوک وعرفان میں بھی جہادی اور تحریکی سرگرمیوں ہی کی طرح جامع اور منصب امامت پر فائز نظر آئے گی۔

استحضارِ الٰہی اور جذبۂ عبودیت: لازمۂ احسان

زیرِ نظر تحریر میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے احسانی وعرفانی مقام کا ایک اجمالی جائزہ مقصود ہے۔ احسان وعرفان سے مراد وہ مواجید واحوال نہیں جنہیں فی زمانہ عرفان واحسان کا لازمہ باور کیا جاتا ہے، اگرچہ وسائل اور ذرائع کے درجے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن یہاں احسان سے مراد بندگی کی وہ

خاص اور متعین صورت ہے جو انسان کی کل زندگی کا احاطہ کر کے اس میں استحضارِ خداوندی اور جذبۂ عبودیت کو پیدا کر دیتی ہے ۔ یہی عبودیت یا بندگی تمام تر فضائل و احسان کی بنیادی صفت ہے ۔ غور کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب میں سب سے بڑا لقب ''عبد'' ہے اور عارفین نے سب سے بڑا مقام ''عبدیت'' ہی کا بتلایا ہے ۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ شبِ معراج اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو کون سا لقب و وصف سب سے زیادہ پسند ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عبدیت''، اسی لیے سورۂ اسراء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی پسند کردہ لقب نازل ہوا ۔ (۱)

بندگی کا جذبہ اگر ذہن، ارادے اور طبیعت میں راسخ ہو جائے تو زندگی کا ہر میلان، ہر فعل اور ہر تأثر بندگی کی کیفیت سے معمور ہو جاتا ہے اور عبودیت اور استحضارِ الٰہی انسان کا ''حال'' بن جاتی ہے ۔ انسان نیت، ارادے، شعور اور عمل ہر سطح پر تفویض اور سپردگی کے مقام پر پہنچ جاتا ہے ۔ اسی استحضارِ الٰہی کے مراقبے اور خوشنودیٔ رب کی جستجو کو عارفین ''اخلاص'' سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے انسان کے ذاتی اوصاف میں اگر ایک طرف خاک ساری وخود احتسابی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب اس کے اعمال واحوال میں برکت اور تھوڑے عمل کی بڑی جزا مرتب ہوتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''رب اشعث مدفوع بالأبواب لو أقسم علی اللّٰہ لأبرہٗ۔'' (۲)

''بہت سارے پریشان حال، پراگندہ حال، گرد وغبار سے اَٹے ہوئے بالوں والے ایسے ہیں جنہیں دروازوں پر دھکیلا جائے، مگر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر اگر وہ قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو سچا کر دکھائے ۔''

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: ذات اور علم کی عینیت

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا درسِ حدیث ہندوستان میں معروف تھا، چالیس سال تک آپ نے دار العلوم دیوبند کی مسندِ تدریس سے ''قال اللّٰہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کی صدائے دل نواز لگائی ۔ آپ کی زبردست شخصیت کے باعث دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے طلبہ کی تعداد ۲۰۰ ر تک پہنچ گئی ۔ آپ کے زمانے میں ۸۶۰ ر طلبہ نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے فراغت حاصل کی ۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ نگار آپ کے درس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حلقۂ درس دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا ۔ قرآن وحدیث حضرت کو اَزبر تھے اور ائمہ اربعہ کے مذاہب زبان پر ۔ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین، فقہاء و مجتہدین کے اقوال محفوظ ۔ تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو ادق اور بھدی بناتے تھے ۔ نہایت سبک اور سہل الفاظ با محاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دریا اُمنڈ رہا ہے ۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے ۔ اب

بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی منحنی جسم اور منکسر المزاج ایک مشت استخوان، ضعیف الجثہ مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا اور بارہا مسجد کے فرش پر بلا کسی بستر کے لیٹا ہوا نظر آتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے، جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کررہا ہے۔'' (۳)

معروف مستشرقہ باربرا مٹکاف [Barbara Metcalf] آپ کی تدریسی خصوصیات کے متعلق لکھتی ہیں:

"He was a man of extraordinary energy, teaching ten lessons each day, writing, caring for Muhammad Qasim in his final illness. He was devoted to the school and resisted all invitations to leave it. His fame was especially great in hadith; and his biographer notes, in the course of his career he taught over a thousand students from such distant places as Kabul, Qandahar, Balkh, Bukhara, Mecca, Medina and Yeman. Among them were Anwar Shah Kashmiri, Shabir Ahmed Osmani and Hafiz Muhammad Ahmad, the Leaders of the third generation of ulama at the school." (4)

حافظے اور استحضار کا یہ عالم تھا کہ:

''شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ کتابیں دھوپ میں رکھنے کے لیے باہر نکالیں، اتفاق سے میبذی کے کچھ ورق پھٹ گئے، حضرت نے ایک طالب علم سے کہا: اس کو لکھ لو، اس نے کہا: کیسے لکھوں؟ میرے پاس وہ کتاب ہی نہیں۔ فرمایا، اچھا! سال گزشتہ پڑھی، امسال بھول گئے؟ پھر فرمایا: اچھا لکھو، میں بولتا ہوں، چنانچہ زبانی لکھوادیا''۔ (۵)

اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حافظے اور استحضار کی لیاقت عارفین کی تصریحات کے مطابق حلال رزق اور نظروں کی حفاظت سے مشروط ہے، جس سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پوری طرح بہریاب تھے۔ علم اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ میں اسی عینیت کو آپ کے شیخ ومربی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مختصر سے فقرے میں سمیٹ کر بیان کردیا ہے کہ: ''محمود علم کا کھٹلا ہے''۔ (۶)

علم وفضل کی یہ لیاقت اور درس وتدریس کی اس شان کے باوجود شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بے نفسی اور فنائیت ایسی تھی کہ خود فرماتے ہیں:

''میں بارہا گنگوہ حاضر ہوا اور جی میں بھی آیا کہ حضرت مولانا [گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ] سے عرض کردوں کہ مجھے بھی حدیث کی سند دے دیجیے، لیکن کبھی اس درخواست کی ہمت نہ پڑی۔ جب اس نیت سے گیا تو یہی خیال ہوا کہ تو یہ تمنا لے کر تو جاتا ہے، لیکن تجھے کچھ آتا جاتا بھی

ہے؟ بارہا خیال ہوا کہ عرض کروں کہ سب کو حضرت سند دیتے ہیں، مجھے بھی سند دیجیے، مگر پھر خیال ہوا کہ مولانا پوچھ بیٹھیں کہ تجھے کچھ آتا بھی ہے، جو سند لیتا ہے؟ تو کیا جواب دوں گا! اس لیے کبھی درخواست کی ہمت نہ ہوئی''۔ (۷)

چلیے تھوڑی دیر کے لیے استاذ اور شیخ کے سامنے، اور وہ بھی مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے استاذ وشیخ کے روبہ رو اس خاک ساری کی توجیہ کی جاسکتی ہے، لیکن مولانا محمد شاہ رام پوری رحمۃ اللہ علیہ تو معاصر تھے، ان کے سامنے خاکساری کا اظہار! واقعہ ملاحظہ فرمایئے! یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کا نفس مزکی ہوچکا ہو۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ثقات سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ مراد آباد میں وعظ کی درخواست کی گئی، بہت کچھ عذر کے بعد منظور فرمایا اور بیان شروع ہوا۔ حدیث یہ تھی: ''فقیہ واحد أشد علی الشیطٰن من ألف عابد'' کے ترجمے کا حاصل ''بھاری'' لفظ سے فرمایا (کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے) مجلس میں ایک پرانے عالم تھے جو محدث کے لقب سے معروف تھے، انہوں نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ: ''أشــــد'' کا ترجمہ غلط کیا گیا، ایسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں۔ تو مولاناؒ بے ساختہ کیا فرماتے ہیں کہ حضرت! مجھ کو تو پہلے سے معلوم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو وعظ کہنا جائز نہیں اور میں نے ان صاحبوں سے اسی واسطے عذر بھی کیا تھا، مگر انہوں نے مانا نہیں، اب بہت اچھا ہوا حضرت کے ارشاد سے بھی میرے عذر کی تائید ہوگئی اور بیان سے بچ گیا۔ حاضرین کو تو جس قدر ناگواری ہوئی اس کا کچھ پوچھنا نہیں، دانت پیستے تھے کہ یہ کیا لغو حرکت تھی۔ گو مولاناؒ نے بجائے ناگوار سمجھنے کے یہ کمال کیا کہ نہایت سکون کے ساتھ ان کے پاس جاکر ان کے سامنے ادب سے بیٹھ کر نہایت نیاز مندی کے لہجے میں ارشاد فرمایا کہ: حضرت! غلطی کی وجہ معلوم ہوجائے تو آئندہ احتیاط رکھوں۔ انہوں نے کڑک کر فرمایا کہ: ''أشد'' کا ترجمہ آپ نے ''أثقل'' سے کیا یہ کہیں منقول نہیں، ''أضـر'' سے کرنا چاہیے۔ مولاناؒ نے فرمایا: اگر کہیں منقول ہو تو؟ انہوں نے کہا: کہاں ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا: حدیثِ وحی میں ہے، کسی نے پوچھا: ''کیف یـأتیک الوحـی؟'' (آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟) جواب میں ارشاد ہوا: ''یـأتیـنـی أحیـانا مثل سلسلة الـجـرس وهـو أشـدہٗ عَلَیَّ'' (کبھی وحی مجھ پر گھنٹیوں کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے) اور ظاہر ہے کہ یہاں ''أضـر'' (زیادہ نقصان دہ) کے معنی ممکن نہیں، ''أثقل'' (زیادہ بھاری) ہی کے معنی صحیح ہوسکتے ہیں۔ بس! یہ سن کر ان کا تو رنگ فق ہوگیا، مگر مولاناؒ نے نہ کچھ اس پر فخر کیا، نہ دوبارہ بیان شروع فرمایا''۔ (۸)

شیخ الہندؒ: فیضِ قاسمی کا شجرۂ طوبیٰ، خاکساری کا نتیجہ

لِلّٰہیت اور خاکساری کے یہی وہ اوصاف تھے جنہوں نے شیخ الہندؒ کو ترکِ ذات کے مقامِ علیا

تک پہنچا دیا تھا، اس لیے کہ خدا کا وعدہ ہے کہ جو تواضع اختیار کرے گا ہم اسے رفعت عطا کریں گے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اسی وصف پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کے نام' گرامی نامے میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو تنکے سے کام لیتا ہے اور پہاڑ رہ جاتا ہے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ اور مولانا عبدالعدل صاحبؒ، حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ذکی حفظ اور ذہن وغیرہ میں اعلیٰ درجہ رکھنے والے تھے۔ مولانا احمد حسن امروہوی رحمۃ اللہ علیہ دوسرے درجے میں تھے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عنایت بھی ان پر سب سے زیادہ تھی۔ ہمارے آقا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ان سب میں گرے ہوئے شمار کیے جاتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے جو کام لیا وہ ان میں سے کسی سے نہیں ہوا اور نہ ہوسکا۔ آج فیض قاسمی عالم میں میزابِ محمودی سے جاری ہے''۔ (۹)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج وطبیعت میں اخفاء کا بھی غلبہ تھا، اپنے علم وفضل کے اخفاء کے حوالے سے آپ ہو بہو اپنے استاذ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم رنگ وآہنگ تھے۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ بہت ہی معروف ہے کہ:

''اس علم نے خراب کیا، ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا''(۱۰)

یہی فقرہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے متعلق منقول ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں علم سے نہ نوازا ہوتا تو اپنے کو اس قدر مٹاتے کہ محمود نام کا کوئی رہ نہ جاتا''۔ (۱۱)

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؒ کی تواضع کی برکت سے آپؒ کے نام کو رہتی دنیا تک کے لیے علم وفضل سے لے کر حریت اور جہاد تک ہر جگہ نمایاں فرمادیا۔

ذوقِ عبادت اور حسنِ معاشرت: اساسِ بندگی

عبودیت اور بندگی کو دو بنیادی اوصاف: ذوقِ عبادت اور حسنِ معاشرت کے بلیغ عنوانات میں سمویا جاسکتا ہے۔ عبادت' بندگی کا لازمہ اور تخلیق کی وجہ اصل ہے۔ لیکن ضابطے کی عبادت اور ذوقی عبادت میں بہت فرق ہے۔ عبادت کا ذوق اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے لیے عبادت دل کا سکون اور لذت وفرحت کا سامان بن جائے۔ عبادت کے دو بنیادی مظاہر ہیں: تلاوت اور نماز۔ ایسا شخص جسے ذوقِ عبادت حاصل ہو تلاوت اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور نماز مخاطبت کا۔ اذکار واوراد کی کثرت اور اس پر استمرار سے مقام عبودیت کو رسوخ کامل حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: باجماعت نماز اور نوافل کا غیر معمولی اہتمام

واقفین حال شہادت دیتے ہیں کہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ذکر، تلاوت اور نماز طبیعت ثانیہ بن

گئی تھیں۔ عبادت کی خشتِ اول نماز باجماعت کی پابندی ہے جس کی عادت رفتہ رفتہ عبادت بن جاتی ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی''۔ (۱۲)

ذوقِ عبادت کا یہ وافر حصہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو زمانۂ طالب العلمی ہی میں عطا ہوا تھا۔ باجماعت نماز کے علاوہ صلوٰۃ اللیل اور دیگر اوراد و وظائف سے متعلق مولانا میاں سید اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا (محمود حسنؒ) ایام طالب علمی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے......دن کو تعلیم وتعلّم کا شغل رہتا تھا، رات کو ادائے اَوراد واذ کار معمولۂ مشائخ اور تعلیم فرمودۂ حضرت استاذ کا۔ شب کو دس گیارہ بجے تک حضرت استاذ (مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں رہتے اور اس کے بعد گاہ گاہ رات کو مطالعہ وسبق دیکھتے۔ ذرا آرام کر کے نوافل اور ذکر اللہ میں مصروف ہو جاتے''۔ (۱۳)

عبادات ومعمولات میں تستّر و اِخفاء کا عالم یہ تھا کہ پوری کوشش فرماتے کہ کسی کو آپ کے معمولات کی خبر نہ ہو۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''صلوٰۃ اللیل سے تو گویا آپؒ کو عشق تھا۔ جب دیکھا کہ سب سو چکے ہیں، چپکے سے اُٹھے اور نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ طویل طویل رکوع اور قیام میں پوری پوری رات گزار دیتے، لیکن جہاں کہیں بھی ذرا سی آہٹ محسوس کرتے کہ کوئی جاگ رہا ہے، فوراً ہی لیٹ جاتے، تاکہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہو جائے کہ حضرت سو رہے ہیں''۔ (۱۴)

کسی بے تکلف نے ایک مرتبہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے یہ دریافت کر لیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لوگوں کے جاگ جانے کے خیال سے نماز کیوں توڑ دیتے ہیں؟ فرمایا:

''بھائی! نفلی نماز کو توڑنے کے بعد دوسرے وقت ان کی قضا میرے لیے زیادہ سہل ہے اور بہتر ہے اس سے کہ لوگ میرے بارے میں حسن ظن رکھیں اور واقع میں میں ایسا نہ ہوں''۔ (۱۵)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: کثرت عبادت کے باعث پاؤں کے ورم پر خوشی

ایک مرتبہ کثرتِ عبادت کی بنا پر پاؤں ورم کر گئے تو اس پر خوش ہو کر فرمایا:

''آج ایک سنّت - ''حتی تورمت قدماہ'' حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم ہائے مبارک کثرتِ قیام کی بنا پر ورم کر جاتے تھے'' - پر آج اتباع نصیب ہوا''۔ (۱۶)

اتباعِ سنت: مجاہداتِ سلوک کا نقطۂ منتہا ومقصود

اتباعِ سنت تمام تر مجاہدات اور سلوک وعرفان کا پھل ہے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی اتباعِ سنت کا یہ عالم تھا کہ:

''قیام دیوبند کے دوران جمعے کے روز دیوبند سے باہر نہر پر تشریف لے جاتے، کپڑے

دھوتے، پھر غسل فرماتے، یہاں تک کہ کپڑے پھریرے اور پہننے کے قابل ہو جاتے تو پہن کر ایسے وقت چلتے کہ جمعے کی اذان ہونے لگتی اور اذان سنتے ہی ایک دوڑ لگاتے کہ آیت کریمہ: ''إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ''..... ''جب نماز جمعہ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو'' پر عمل ہو سکے''۔ (۱۷)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: عبادت اور اطاعت کا مظہر کامل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''رأس الأمر فالإسلام وأما عمودہٗ فالصلوٰۃ وأما ذروۃ سنامہٖ فالجہاد۔''(۱۸)

''اس چیز (دین) کا سر اسلام ہے، اس کا ستون نماز اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے۔''

بندگی کی غایت اصلی کے دو بڑے مظاہر ہیں: نماز اور جہاد۔ بندگی کے تشکیلی عناصر کا دائرہ ان ہی دو قوسوں سے مکمل ہوتا ہے۔ یہ دونوں مظاہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہی نہیں، عین یک دیگر ہیں اور غایت ان کی ایک ہے: بندگی۔ نماز عبادتِ الٰہی کا مظہر کامل ہے اور جہاد نیابتِ الٰہی کا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں بندگی کے یہ دونوں مظاہر پوری شان سے جلوہ گر تھے۔ جہاد سے وابستگی ہی نے انہیں ''اسیر مالٹا'' بنایا تھا۔ اور نماز جسے متذکرہ حدیث میں عبادت کے استعارے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس میں انہماک کا عالم یہ تھا کہ فرائض تو فرائض ہی تھے، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے معمولہ نوافل، اَوراد و اذکار اور معمولات کی اس پابندی میں نہ درس و تدریس کی مشغولیت رکاوٹ بنتی تھی نہ ہی تحریک و جہاد کی مصروفیت، حتیٰ کہ ایام اسیری میں بھی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ معمولات اپنی ترتیب کے مطابق انجام دیتے رہے۔ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''مولانا عشاء کی نماز کے بعد بہت تھوڑی دیر جاگتے تھے، کچھ اپنے اَوراد پڑھتے تھے اور پھر پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر وضو فرماتے۔ کبھی کبھی باتیں بھی کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے، کیوں کہ دس بجے کے بعد حکماً روشنیاں بجھا دی جاتی تھیں۔ جہاں دس بجے اسی وقت سپاہی آواز دیتا تھا، سب چراغ اور موم بتیاں بجھانی پڑتی تھیں اور پھر تمام شب جلانے کی اجازت نہ تھی۔ جہاں جہاں کمروں میں برقی روشنیاں تھیں وہاں خود ہی بجھ جاتی تھیں۔ البتہ پھر وہ برقی روشنیاں جو کیمپ اور راستوں کی روشنی کے لیے تھیں وہ تمام رات جلا کرتی تھیں، ان کا تار برقی کمروں کی روشنی کے تار سے علاحدہ تھا۔ الغرض دس بجے سے سب لوگ سو جاتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے شب کو اُٹھتے اور نہایت دبے دبے پیروں سے نکلتے دروازے سے باہر تشریف لاتے، پیشاب سے فارغ ہو کر وضو فرماتے، گرمیوں میں تو گرم پانی کی ضرورت ہوتی ہی نہ تھی، نل کا پانی مناسب ہوتا تھا۔ سردی کے زمانے میں ہم نے یہ خاص اہتمام کیا تھا کہ چولہے پر کھانے کے بعد ایک بہت بڑے ٹین کے

لوٹے میں جو کہ چائے کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے ملتا اور اس میں ٹینٹو پیچ دار لگی ہوئی تھی اور اس میں ہمارے معمولی دس بارہ لوٹے پانی آجاتا تھا‘ پانی خوب گرم کرلیا جاتا تھا اور پھر اسی پاس والے کمرے میں جہاں پر نل لگا ہوا تھا، اس لکڑی کے تخت پر جس پر سب کپڑے دھوتے تھے ایک کمبل میں لپیٹ کر عشاء کے بعد رکھ دیتے تھے۔ یہ پانی صبح تک خوب گرم رہتا تھا، حال آں کہ سردی بہت ہی زیادہ پڑتی تھی، اندھیرے ہی میں جا کر اس میں نماز تہجد ادا فرماتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہوجاتے تو پھر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور صبح تک مراقبہ اور ذکرِ خفی میں مشغول رہتے تھے اور ہزار دانوں کی تسبیح ہمیشہ سرہانے رکھی رہتی تھی۔ اسمِ ذات کی کوئی مقدار معین کر رکھی تھی، اس کو ہمیشہ بالتزام پورا فرماتے۔ مراقبے کا اس قدر انہماک ہوگیا تھا کہ بعض اوقات میں دو دو تین تین مرتبہ باتیں دھراتے، مگر سمجھتے نہ تھے۔ صبح کی نماز سے پیشتر اکثر پیشاب کرتے اور وضو کی تجدید فرما کر نماز باجماعت ادا فرما کر وہیں مصلے (سجادہ) پر آفتاب کے بلند ہونے تک مراقب رہتے تھے۔ اس کے بعد اشراق کی نماز ادا فرما کر اپنے کمرے میں تشریف لاتے۔ اس وقت مولانا کے لیے اُبلے ہوئے انڈے اور چائے تیار رہتی تھی‘ وہ پیش کردی جاتی تھی۔ اس کو نوش فرما کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے تھے۔ اس سے فارغ ہوکر کچھ ترجمۂ قرآن شریف تحریر فرماتے یا اس پر نظر ثانی کرتے یا اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط تحریر فرماتے یا وحید کو سبق پڑھاتے۔ اتنے میں کھانے کا وقت آجاتا، کھانا تناول فرما کر چائے نوش فرماتے تھے۔ اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لیے وروالہ یا سینٹ کلیمنٹ کیمپ یا بلغار کیمپ میں جانا ہوتا تو وہاں کا قصد فرماتے اور کپڑے پہن کر تیار ہوجاتے تھے اور اگر جانے کا قصد نہ ہوتا تو آرام فرماتے اور اگر کوئی ملنے کے لیے دوسرے کیمپ میں سے آتا تو اس سے باتیں کرتے۔ اگر تیز گرمی کا زمانہ ہوتا تھا تب تو وہیں چارپائی پر اور اگر کچھ بھی سردی ہوتی تو صحن میں دھوپ میں قیلولہ فرماتے تھے۔ وہاں پر ہم سب دو تین گدّے ڈال دیتے اور اس پر کمبل اور تکیہ بچھا دیا جاتا تھا اور اگر کسی نے غفلت کی تو خود تکیہ لے جاتے اور ان گدّوں اور کمبل کو بچھا کر آرام فرماتے۔ دو تین گدّے ہم نے زائد اسی واسطے لے رکھے تھے جو کہ ہمیشہ علاحدہ رکھے رہتے تھے اور جب تک وہ حاصل نہ ہوئے تھے تو بعض چارپائیوں کے گدّے اٹھا لیے جاتے تھے۔ تقریباً دو یا ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح آرام فرماتے تھے۔ پھر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور پھر وضو فرمانے کے بعد تلاوتِ قرآن شریف، دلائل الخیرات، حزب الاعظم وغیرہ میں مشغول ہوتے، مگر قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے۔ غالباً روزانہ دس بارہ پارے پڑھتے تھے۔ ظہر کی اذان تک اسی حالت میں رہتے تھے، پھر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز سے فارغ ہوکر اگر وحید کا سبق ہوتا تو کبھی اس وقت میں اور کبھی صبح کو اپنے اَوراد سے فارغ ہوکر کھانے کے وقت تک

پڑھاتے تھے، بلکہ اکثر صبح ہی کو پڑھاتے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد اکثر مولانا رحمۃ اللہ علیہ ذکرِ خفی لسانی میں مشغول ہوتے تھے، وہ ایک ہزار دانے والی تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے اور ذکر کرتے تھے۔ مغرب کے بعد بھی ذکرِ خفی میں مشغول ہوجاتے تھے۔''(۱۹)

حوالہ جات

۱:......ادریس کاندھلویؒ، سیرۃ المصطفیٰ، کراچی: مکتبہ عمر فاروق، ۲۰۱۰ء، جلد:۱، ص:۲۶۳۔

۲:......مسلم بن الحجاج القشیریؒ، الصحیح المسلم، کتاب البر والصلۃ، رقم:۱۲۸۱۔

۳:......عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۲۰۰۱ء، ص:۲۳۶۔

4:Barbara Metcalf, "The Madrasa at Deoband: A Model for Religious Education in Modern India", Modern Asian Studies, 12, I, [1978], p. 122.

۵:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۹۲ء، جلد:۲، قسط:۷، ص:۹۳۔

۶:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، [مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری]، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۲۰۰۷ء، ص:۱۴۳۔

۷:......محمد زکریا سہارن پوریؒ، آپ بیتی، لاہور: مکتبہ الحرمین، [س-ن]، جلد:۲، ص:۶۰۷۔

۸:......اشرف علی تھانویؒ، ''ذکر محمودؒ''، مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ، ص:۵۳۰-۵۳۱۔

۹:......حسین احمد مدنیؒ، مکتوبات شیخ الاسلام، کراچی: مجلس یادگار شیخ الاسلام، ۱۹۹۴ء، جلد:۲، ص:۲۰۰-۲۰۱، مکتوب:۶۲۔

۱۰:......محمد یعقوب نانوتویؒ، ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی''، مشمولہ نادر مجموعہ رسائل جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، کراچی: میر محمد کتب خانہ، [س-ن]، ص:۸۔

۱۱:......میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ، لاہور: ادارۂ اسلامیات، ۱۹۷۷ء، ص:۱۶۷۔

۱۲:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، ص:۱۵۰۔

۱۳:......میاں اصغر حسینؒ، حیات شیخ الہندؒ۔

۱۴:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، ص:۱۵۰۔

۱۵:......ایضاً، ص:۱۵۱۔

۱۶:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، لاہور: مکتبہ مدنیہ، ۱۹۸۶ء، جلد:۱، ص:۱۰۶۔

۱۷:......ایضاً۔

۱۸:......المستدرک علی الصحیحین، بیروت: دارالکتب العلمیۃ، کتاب الجہاد، جلد۲، ص:۸۶، رقم:۲۴۰۸۔

۱۹:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، ص:۱۵۱-۱۵۳۔

(جاری ہے)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا احسانی وعرفانی مقام

(دوسری قسط)

جناب محمد ظفر اقبال

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: مجاہدانہ سرگرمیوں کی عدمِ قبولیت کے خوف سے گریہ

دین کی سربلندی اور خلافت اسلامی کی بقا واستحکام کے لیے زندان واسیری، عبادات واذکار کی پابندی اور ترجمۂ قرآن کی سعادت کے باوصف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت یہ تھی کہ:

''جس وقت مالٹا میں تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے رو رہے تھے، ساتھیوں نے پوچھا: کیا حضرت گھبرا گئے ہیں؟ یہ لوگ سمجھے کے گھر بار یاد آرہا ہوگا یا جان جانے کا خوف ہوگا۔ فرمایا کہ: میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں جو تم سمجھے ہو، بلکہ اس وجہ سے رو رہا ہوں کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں یہ مقبول بھی ہے یا نہیں؟!''(۱)

حسنِ خلق بھی عبادت ہے

ذوقِ عبادت اور بندگی کا ایک اہم، عظیم اور غالب حصہ مخلوقات سے معاملات اور تعلقات سے متعلق ہے، اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''الخلق عیال اللّٰہ، فأحب الناس إلٰی اللّٰہ من أحسن إلٰی عیالہٖ۔''(۲)

''مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبت اس شخص سے ہے، جو اس کے کنبے سے حسن سلوک سے پیش آئے''۔

عام طور پر یہ بات قابل مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ یا عالم درس وتدریس، تصنیف وافتاء یا صوفیانہ امور میں مشغول رہتا ہے تو اسے بالعموم کاروبارِ دنیا اور لوگوں سے میل جول اور تعلق واختلاط سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے، بلکہ پیش قدمی کرکے اگر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ فی زمانہ مؤخر الذکر غفلت اور اول الذکر انہماک ہی کو سلوک وعرفان کی معراج سمجھا جانے لگا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ رویہ فی الحقیقت سیرت نبویؐ، اسوۂ صحابہؓ واہل بیتؓ اور اخلاقِ صوفیہ تینوں کے منافی ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی غیر متوازن شخصیت کا غماز بھی

ہے جو دین کے ایک بہت اہم اور بڑے حصے سے خود کو اپنی ان انفرادی ''ذمے داریوں'' کے باعث مستثنٰی سمجھنے لگتا ہے، جس کے حصول اور جس کی ادائیگی کے لیے نصوص میں متواتر ترغیب وتحریص دلائی گئی ہے:

طریقت بہ جز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: ذوقِ عبادت اور حسنِ خلق کے جامع

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسلاف کے طریق کی اتباع وپیروی میں عبادت واخلاق دونوں کے توازن کا مظہر تھے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے عبادات ومعاملات کے مابین توازن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طالب علمی کی زندگی کے بعد متصلاً ہی معلمانہ زندگی کا آغاز ہوجاتا ہے۔ یہ زندگی بھی آپ کی مکمل ترین زندگی ہے۔ دن میں دس دس، گیارہ گیارہ گھنٹے درس کے بعد سلوک وتصوف کے تمام اشغال نہایت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ صلوٰۃ باجماعت کا تو اس قدر اہتمام تھا کہ تکبیر اولیٰ تک فوت نہ ہوتی۔ غرض کہ پورا دن اسی مشغولیت میں صرف ہوتا۔ مہمانوں کی کثرت، ان کی دیکھ بھال اور خدمت، بال بچوں کی تربیت اور اہلِ بیت کے حقوق کی ادائیگی، غرض کہ کوئی سی مشغولیت بھی آپ کو صلوٰۃ باجماعت، ادائے اوراد و وظائف اور قیام اللیل سے مانع نہ ہوتی تھی''۔ (۳)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: طالبان علوم سے تعلق اور شفقت

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ ظاہر ہے طالبان علوم سے ان کا سابقہ واسطہ ہمہ وقتی تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے احوال کا مطالعہ اس بات کو واضح کردیتا ہے کہ آپؒ طالبان علوم کے لیے بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''(شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو) طالب علموں سے بے حد انس تھا''۔ (۴) آپؒ کا علمی رعب اور آپؒ کی عرفانی وجاہت آپؒ کے اور طلبہ کے درمیان کبھی حائل نہ ہوتی۔ طلبہ بے تکلف آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ایک دن طلبہ نے کہا:

''حضرت تیرنا سکھلا دیجیے۔ چنانچہ جمعے کے دن سویرے طلبہ کو ہمراہ لے کر دیوبند سے باہر تالاب پر گئے اور ہر ایک کو تیرنا سکھایا۔ ایک پنجابی طالب علم نے کہا: حضرت! لائیے! میں آپ کی کمر مل دوں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر ملنا شروع کردی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا جسم بہت نرم تھا، طالب علم نے سمجھا میل بہت ہے، اس لیے فوراً ہی ریت اٹھا کر ملنا شروع کیا، جس کی وجہ سے کھال چھل گئی، مگر حضرت نے اُف نہ کی۔ جب واپس ہوئے تو راستے میں ایک بیل کو

دیکھا جس کی کمر سے خون جاری تھا، پنجابی طالب علم نے کہا: کسی ظالم نے اس کو کتنی بری طرح مارا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا: جی ہاں! کسی پنجابی نے اس کی کمر ملی ہوگی''۔ (۵)

اللہ اکبر! ایک تو طلبہ پر شفقت کا یہ عالم، اس طالب علم کی غلطی اور اپنی تکلیف پر ادنیٰ گرانی کا اظہار کیے بغیر بات کو مزاح میں ٹال دینا یہی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا وصف تھا۔

شیخ الہندؒ: بے نفسی اور عاجزی کا عظیم مظہر

عجب اور تکبر کے بالمقابل بے نفسی و تواضع ہے۔ اس کی حقیقت زبانی اظہار سے زیادہ عملی ہے۔ یہ خود کو محض ہیچ مداں، احقر، خاکسار اور فقیر کہہ دینے سے عبارت نہیں، بلکہ اس کی حقیقت خود کو کسی بھی امتیازی وصف کی بنا پر عام لوگوں سے بلند سمجھے جانے کی عملی نفی ہے۔ بلکہ عارفین نے تو یہ بات نہایت وضاحت سے فرمائی ہے کہ جس نے اپنے لیے تواضع کو ثابت کیا وہ بے شبہ متکبر ہے، کیوں کہ تواضع کا دعویٰ تو اپنی رفعتِ قدر کے مشاہدے کے بعد ہوگا، پھر جب اپنے لیے تواضع کا دعویٰ کیا گیا تو گویا اپنے مرتبے کی بلندی کا مشاہدہ کیا، یہی تکبر ہے۔ بے نفس، متواضع اور عجب سے پاک شخص ہمیشہ عام انسانوں میں گھلا ملا رہتا ہے۔ اس کے انداز واطوار حاکمانہ نہیں ہوتے اور نہ وہ خوردوں سے کسی بڑائی یا تعظیم کا متمنی ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس وصف میں بھی نمایاں اور ممتاز تھے، مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا طبعی مذاق تھا کہ وہ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے اور اپنی عادت، لباس، چال، معاملات وغیرہ اس قسم کا رکھنا چاہتے تھے۔ اہل دنیا اور امراء اور تکلف والوں سے گھبراتے تھے ...... ریل میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند فرماتے تھے''۔ (۶)

وہ بداہتہً خود کو ہر کمال اور عظمت سے مُعَرَّا باور کرتے تھے۔ مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''اس رفعتِ شان پر بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا نفس کا کوئی تقاضا باقی ہی نہیں رہا تھا، یا اس کے پورے ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی، یا اُسے پامال کرنے کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی تھی''۔ (۷)

اس سلسلے میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے تین واقعات ملاحظہ کیجیے۔ یہ عاجزی وفروتنی آج بھی عوام سے زیادہ خواص سے اتباع وتقلید کا مطالبہ کررہی ہے۔ قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں اکثر مساجد میں کسیر بچھادی جاتی تھی جو نرم بھی ہوتی تھی اور گرم بھی، یہ گھاس تالابوں میں پیدا ہوتی ہے، جب سوکھ جاتی ہے تو لوگ اسے بچھانے کے لیے لے آتے تھے، اسے دیہات کا قالین یا نرم گدہ سمجھنا چاہیے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں بھی سردیوں میں برابر اس کا فرش ہوتا تھا۔ موسم سرما آنے پر ایک دن خود ہی طلبہ سے فرمایا

کہ آؤ بھئی! مسجد کے لیے کسیر لے آویں۔ چار طلبہ کے ساتھ ہو لیے، انہیں حضرت اپنے باغ میں لے گئے، وسطِ باغ میں تالاب بھی تھا اور اس پر کسیر بہ کثرت پیدا ہوتی تھی، چنانچہ کسیر کاٹی گئی، خود حضرت بھی درانتی سے کاٹنے میں شریک رہے، کاٹ کر جمع شدہ ذخیرے کے پانچ گٹھڑ بنائے۔ طلبہ نے عرض کیا کہ: حضرت! پانچ گٹھڑیاں کیوں بنائی گئی ہیں؟ ہم تو چار ہیں۔ فرمایا: اور میرا حصہ کہاں گیا؟ یہ کہہ کر چار بڑی بڑی گٹھڑیاں تو طلبہ کے سروں پر رکھوائیں اور ایک اپنے سر پر رکھی۔ ہر چند طلبہ بہ ضد ہوئے کہ حضرت! اس ذخیرے کی چار گٹھریاں کردی جائیں، ہم کافی ہیں، کچھ زیادہ بوجھ نہیں، مگر حضرت نے نہ مانا، چار گٹھریاں طلبہ کے سروں پر اور ایک اپنے سر پر رکھ کر یہ قافلہ چلا، شہر میں آیا اور بازار کے ایک حصے میں سے گزرا، ان طلبہ کو تو ممکن ہے کہ سر پر گھاس رکھ کر بازار میں سے گزرنے پر کچھ عار آرہا ہو، لیکن حضرتؒ کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ گویا اپنے کو اس بوجھ اٹھانے کا اہل اور مستحق سمجھ کر شہر سے گزر رہے تھے۔ دیہات والے بھی اب جسے پسند نہیں کرتے موصوف کے یہاں وہ بوجھ ایک معمولی بات تھی۔‘‘(۸)

قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعے سے متصل ایک اور واقعہ بھی نقل کرتے ہیں جس میں تواضع، خاکساری، للّٰہیت، شفقت، محبت اور حسن ادا سب ہی اسباق موجود ہیں، قاری صاحبؒ لکھتے ہیں:

’’میرے خسر مولوی محمود صاحب رام پوری فرماتے تھے کہ وہ دیوبند میں طالب علمی کے زمانے میں چھوٹی مسجد میں رہا کرتے تھے، جس میں حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا قیام تھا، اس زمانے میں طلبہ میں چارپائی کا دستور نہ تھا، سادگی اور تواضع سے عموماً طلبہ زمین پر لیٹتے تھے۔ مولوی صاحب باوجود رئیس گھرانے کا ایک فرد ہونے کے عام طلبہ کی طرح فرشِ زمین پر ہی اپنے حجرے میں لیٹا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا موصوف سے اور رام پور کے اس گھرانے سے بہت گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا اور مولوی محمود صاحب مرحوم سے یوں بھی خصوصیت زیادہ تھی۔ ایک دن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چھوٹی مسجد میں تشریف لائے اور مولوی محمود صاحب کے حجرے پر گزر ہوا، یہ زمین پر فرش بچھائے لیٹے تھے، فرمایا: محمود! تیرے پاس چارپائی نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! چارپائی تو نہیں ہے، مجھے زمین پر لیٹنے کی عادت ہوگئی ہے، اس سے بہت متاثر ہوئے، مگر فرمایا کچھ نہیں، اگلے دن دوپہر کا وقت تھا، گرمی شدید تھی، لو چل رہی تھی کہ مولوی صاحب نے کھڑکی سے دیکھا، حضرت اپنے کندھے پر ایک چارپائی لیے خود تشریف لا رہے ہیں، وزنی چارپائی ہے مگر اسے سر پر اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب صورت حال دیکھتے ہی حجرے سے نکل ننگے سر اور ننگے پیر حضرت کی طرف دوڑے، حضرت انہیں بھاگتا ہوا دیکھ کر وہیں سڑک پر کھڑے

ہوگئے اور چارپائی زمین پر رکھ دی، جب قریب پہنچے تو ایک خاص انداز سے فرمایا: جناب! یہ لے جاؤ اپنی چارپائی، مجھ سے نہیں اٹھتی، میں بھی شیخ زادہ ہوں، مجھ سے یہ چارپائیاں نہیں گھسیٹی جاتیں۔ یہ فرما کر پیٹھ پھیر لی اور گھر روانہ ہوگئے۔ مولوی صاحب کچھ کہنے ہی نہ پائے اور چارپائی اٹھا کر حجرے میں لے آئے، گویا انہیں کوئی کلمۂ معذرت بھی نہیں کہنے دیا کہ وہ معنیً ثناءِ حسن ہوجاتی۔'' (۹)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: بہ یک وقت اپنے معمول کی پابندی اور طلبہ کی رعایت

قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی نقل کرتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ ہر جمعرات کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضری کے لیے گنگوہ کا سفر پیدل کرتے تھے، جمعرات کو چھٹی کا گھنٹہ بجتا، اسی وقت سبق سے اٹھ کر گنگوہ کا راستہ لیتے۔ گنگوہ دیوبند سے ۲۲ کوس یعنی ۳۰ میل ہے۔ حضرت اذان عصر پر چلتے اور عشاء گنگوہ پڑھ لیتے تھے۔ جمعے کا پورا دن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گزار کر اذانِ عصر کے قریب گنگوہ سے واپس ہوتے اور عشاء دیوبند میں پڑھ لیتے تھے۔ برس ہا برس یہ معمول رہا، سردی ہو یا گرمی یہ معمول قضا نہ ہوتا تھا۔

مولوی محمود صاحب کا بیان ہے کہ ایک دن ہم دو تین طلبہ نے اصرار کیا کہ حضرت! ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ فرمایا: اچھا، مگر اس دن حضرت نے ان طلبہ کی رعایت سے پیدل سفر کرنے کے بجائے ارادہ کیا کہ سفر سواری پر ہو، تو کمہار کا ایک ٹٹو کرایہ پر لے لیا اور ارادہ یہ کیا کہ دو تین طلبہ اترتے چڑھتے چلے جائیں گے، چنانچہ کمہار ٹٹو لے کر دارالعلوم کے دروازے پر آ گیا۔ حضرت حسبِ معمول اذانِ عصر کے قریب درس سے اٹھے، یہ طلبہ بھی حاضر تھے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ: بھائی میاں محمود! پہلے تم سوار ہو، پھر باری باری ہم بھی سوار ہوتے رہیں گے۔ انہوں نے حضرتؒ کے سوار ہونے پر اصرار کیا تو حضرتؒ نے نہ مانا اور زبردستی مولوی محمود صاحب کو سوار کر دیا۔ دو طلبہ اور خود حضرت پیچھے پیچھے پیدل روانہ ہوئے، بلکہ ایک قمچی لے کر ٹٹو کو ہنکانا بھی اپنے ذمے لے لیا۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ میں سخت ضیق میں تھا کہ حضرت تو پیچھے پیچھے پیدل ہیں اور میں سوار ہوں، مگر مجبور تھا، حکم یہی تھا، دو چار میل چل کر یہ ٹٹو سے اتر گئے تو حضرتؒ نے زبردستی دوسرے طالب علم کو بٹھا دیا اور خود ٹٹو ہانکتے جا رہے ہیں۔ چار پانچ میل کے بعد دوسرے طالب علم کو چڑھا دیا۔ غرض تیس میل کا سفر پورا طے ہوگیا، مگر خود نہیں چڑھے، باری باری ان طلبہ کو بٹھاتے رہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ ٹٹو اپنے لیے کرائے پر نہیں لیا تھا،

بلکہ ان طلبہ کے لیے شفقۃً لیا گیا تھا۔ جمع کو واپسی ہوئی تو طلبہ گھبرائے کہ اب پھر وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ٹٹو پر سوار ہوں گے اور حضرت پیدل چلیں گے، باہم مشورہ ہوا کہ آخر کیا صورت اختیار کی جائے کہ ہم پیدل چلیں اور حضرت کو ٹٹو پر سوار کر دیں۔

مولوی محمود صاحب فرماتے تھے کہ: میں نے کہا: ترکیب تو میں کردوں گا کہ حضرت پورے راستے ٹٹو سے نہ اتر سکیں، مگر ایک دفعہ سوار کردینا ہے۔ چنانچہ جب گنگوہ سے روانگی ہوئی تو حسبِ معمول طلبہ پر زور دیا کہ سوار ہو، مگر یہ لوگ ایکا کر چکے تھے، عرض کیا کہ: حضرت! آتے ہوئے ہم سوار رہے، اب واپسی میں یہ نہیں ہوگا، حضرت سوار ہوں خواہ پھر اتر لیں، مگر ابتدا حضرت ہی کے سوار ہونے سے ہوگی۔

جب یہ سب اکٹھے ہو کر بہ ضد ہوئے تو آخر حضرت نے قبول فرمالیا اور ٹٹو پر سوار ہوگئے۔ طلبہ نے چپکے سے مولوی محمود سے کہا کہ تم اب وہ موعودہ ترکیب کرو کہ حضرت دیوبند تک ٹٹو سے نہ اترنے پائیں، چنانچہ مولوی صاحب نے وہ مؤثر نسخہ استعمال کیا کہ جب حضرت سوار ہوگئے تو انہوں نے ٹٹو کے برابر میں آکر حضرت نانوتویؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ، حضرت حافظ شہیدؒ وغیرہ اکابر کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حضرت کی عادت تھی کہ ان بزرگوں کا ذکر چھڑتے ہی ان میں محو ہو جاتے تھے اور پھر ادھر اُدھر کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی۔

ان حضرات کا ذکر چھڑتے ہی جو حضرت نے ان بزرگوں کے واقعات بیان کرنے شروع کیے تو حضرت کو نہ راستے کی خبر رہی نہ ان طلبا کی، پورے تیس میل کا سفر طے ہوگیا، ندی آگئی جو دیوبند سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔ ندی دیکھتے ہی حضرت نے گھبرا کر فرمایا کہ اوہو! ندی آگئی اور یہ کہہ کر ٹٹو سے کود کر اترے۔ فرمایا: بھائی میں نے تم سب کا حق مار لیا، لو جلدی سے تم سوار ہو۔ طلبہ نے ہر چند حضرت کے بیٹھنے کا اصرار کیا، مگر حضرت تہیہ فرما چکے تھے، کسی کی نہیں سنی، باری باری ان لوگوں کو بٹھلایا۔ شہر میں داخل ہوئے تو پھر اسی شان سے کہ طلبہ سوار ہیں اور حضرت پیدل ہیں، قمچی ہاتھ میں ہے اور ٹٹو ہانک رہے ہیں۔ جس سے طلبا بچنا چاہتے تھے بالآخر وہی چیز پھر سامنے آکر رہی۔ سبحان اللہ! بے نفسی اور شفقت کی انتہا ہے۔ (۱۰)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ : اتباعِ شیخ کا مثالی نمونہ

اس مقام پر اگرچہ یہ واقعہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے معمول کی پابندی اور طلبہ کے حق میں شفقت و رعایت کی غرض سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر اس سے متصل ایک اور اہم واقعہ بیان نہ کیا جائے تو بات ادھوری رہ جائے گی اور منازلِ سلوک واحسان میں شیخ کی اتباعِ کامل کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا اُسوہ پوری طرح نکھر کر سامنے نہیں آسکے گا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول ذکر کیا جا چکا ہے کہ آپ کا جمعرات کے

روز چھ گھنٹے پڑھانے کے بعد دیو بند سے گنگوہ پیدل جانے کا معمول تھا۔ایک دفعہ:

''شیخ الہندؒ کے دوست نے جو زمانہ طالب علمی سے دوست تھے اور بعد میں سرکاری ملازمت اختیار کرلی تھی، پوچھا کہ او محمود! بتا تو دے، گنگوہ میں کیا رکھا ہے جو تو ہر جمعرات کو دوڑا دوڑا جاتا ہے؟ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ظالم تو نے پی ہی نہیں! اب کے تو بھی چل! وہ ساتھ جانے پر تیار ہوگیا، چناں چہ ساتھ لے گئے، اتفاق سے ان دنوں شاہ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عرس ہورہا تھا۔حضرت امام ربانی [گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ] کا معمول عرس کے ایام میں ابتداءً تو یہ تھا کہ ان دنوں میں گنگوہ چھوڑ دیتے تھے، خانقاہ خالی کردیا کرتے تھے اور جب معذور ہوگئے تھے تو سفر ترک فرمادیا تھا۔ ہاں! خانقاہ میں نہیں آتے تھے، البتہ نماز کے لیے پانچوں وقت تشریف لاتے، بلکہ نماز خود ہی پڑھایا کرتے تھے۔اتنا لحاظ عرس والے بھی کرتے تھے کہ اذان کے وقت سے جماعت ختم ہوجانے اور سنتیں وغیرہ پڑھنے تک قوالی بند کردیا کرتے تھے۔ان ایام میں حضرت کے یہاں مہمانوں کی آمدورفت بالکل بند رہتی تھی، کسی سے مصافحہ تک نہیں کرتے تھے۔غرض حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت گنگوہ پہنچے اور حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے۔حضرت نے دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کردیا اور فرمایا: ابھی واپس جاؤ۔آپ [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ] کے ایک اور بھائی اور دوست تھے: شاہ مظہر حسن گنگوہیؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ محشی ابوداود کے بھائی، انہوں نے عرض کیا: حضرت! یہ عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، آپ کے پاس آئے ہیں۔ حضرت (گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) نے ارشاد فرمایا: میں بھی جانتا ہوں عرس میں شرکت کے لیے نہیں آئے، میں اتنا بھولا نہیں ہوں، میرے پاس آئے ہیں، مگر آئے تو ہیں اس مجمعے میں ہوکر، ان کے ذریعے اس مجمعے کی رونق تو بڑھی، ''من کثر سواد قوم فھو منھم''.....''جس نے کسی قوم کے افراد میں اضافہ کیا وہ ان ہی میں سے ہے'' وارد ہوا ہے، قیامت کو اپنی براءت کرتے رہیں۔اس کے بعد شاہ مظہر حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ] کو اپنے مکان پر لے گئے اور کہا روٹی تو کھالو۔ اس پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آب دیدہ ہوکر فرمایا کہ: ''حضرت تو فرماویں ابھی چلا جا، میں کس منہ سے کھاؤں!'' چنانچہ اسی وقت گنگوہ سے واپس ہوگئے، پھر دوسرے وقت عرس ختم ہونے کے بعد حاضر ہوئے''۔ (۱۱)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت، ۲۲/میل کا پیدل سفر

جس انسان کا نفس اس درجے مزکی اور مطہر ہوچکا ہو، اس کا قلب اپنے محسنین اور اساتذہ جن سے اسے علم وفضل اور صلاح وتقوی بلکہ ایمان میں رسوخ اور عمل میں دوام کی دولت میسر آئی ہو' کی محبت

سے کس درجے لبریز ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ محبت ہی انسان کو محبوب کا خادم اور محبوب کو مخدوم بناتی ہے۔ اس خدمت کا صرف ایک نمونہ دیکھئے! ایک مرتبہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بخار تھا، زمانہ برسات کا تھا اور آنا دیوبند تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو گھوڑے پر سوار کیا، ایک ہاتھ سے اس کی لگام پکڑی اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہو کر حضرت کی کمر کو سہارا دیا اور اس طرح ۲۲ رمیل کا راستہ پیدل طے کیا۔ (۱۲)

۲۲ رمیل کا پیدل سفر یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو استاذ کی محبت نے بے خود کر دیا ہو۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی اولاد سے بڑھ کر خدمت

چلئے!!! حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ تو استاذ تھے، اس طرز کی خدمت کی مثالیں ڈھونڈنے سے دیگر باصفا حضرات کے یہاں بھی مل جائیں گی، لیکن ایک واقعہ اس سے زیادہ حیران کر دینے والا ہے جو استاذ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں بلکہ ان کے والد محترم سے متعلق ہے۔ مولانا قاری طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت نانوتویؒ کے والد شیخ اسد علی مرحوم جب مرض وفات میں شدید مبتلا ہوئے تو علاج کے لیے دیوبند لائے گئے، قیام شیخ الہندؒ کے مکان پر ہوا، دستوں کا مرض تھا..... ایک دفعہ دست چارپائی پر خطا ہوگیا، اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہاں موجود نہ تھے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے اور صورت ایسی ہوگئی کہ نجاست اٹھانے کے لیے ظرف (برتن) بھی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بے تکلف ساری نجاست اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں میں لے لی اور سمیٹنی شروع کر دی، تمام ہاتھ گندگی میں آلودہ ہی نہ تھے بلکہ ہاتھوں میں نجاست لبریزی کے ساتھ بھری ہوئی تھی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے اور دیکھا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں ہاتھ نجاست اور مواد سے بھرپور ہیں اور وہ اسے سمیٹ سمیٹ کر بار بار باہر جاتے ہیں اور پھینک پھینک کر آتے ہیں۔ اس پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بہت متاثر ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور عرض کیا کہ خداوند! محمود کے ہاتھوں کی لاج رکھ لے اور اس خاص وقت میں جو جو بھی اپنے اس محبوب تلمیذ کے لیے مانگ سکتے تھے ہاتھ اٹھائے ہوئے مانگتے رہے۔'' (۱۳)

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اولادوں سے خادمانہ برتاؤ کے مظاہر

اس خدمت ومحبت اور مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل سے نکلی ہوئی دعاؤں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت ورفعت کو ثریا تک پہنچا دیا۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے ذہین وذکی تلامذہ

ہوں گے، لیکن آج ان کی اکثریت کا نام تاریخ اور ماضی کے دھندلکوں کی نظر ہو چکا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا نام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایسے جڑا ہوا ہے جیسے رومیؒ کا شمس تبریزؒ کے ساتھ۔ یہ استاذ کی محبت ہی کا اثر ہے کہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ جو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، کے متعلق شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''حافظ احمد کا میرے دل میں اتنا احترام ہے کہ اگر وہ پاخانے کی ٹوکری اٹھانے کو بھی مجھ سے کہیں تو میں اس کی تعمیل کو اپنی عزت سمجھوں گا۔'' (۱۴)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ' حافظ صاحب کے استاذ ہوتے ہوئے بھی ان کے سامنے مؤدب اور نیازمندانہ بیٹھا کرتے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی کہ جب حافظ صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے جاتے اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ صحن مکان میں چارپائی پر بیٹھے ہوتے، دروازے کے سامنے کی سڑک کی لمبی مسافت سے جہاں حافظ صاحب آتے ہوئے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو نظر پڑ جاتے تو حضرتؒ چارپائی چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور اس وقت تک کھڑے رہتے تھے جب تک کہ حافظ صاحب مکان میں پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھ نہ جائیں اور ان کے بٹھانے کی صورت یہ ہوتی تھی کہ حضرت شیخ کرسی منگواتے، اسے اپنے سرہانے بچھاتے، جب حضرت حافظ صاحب اس پر بیٹھ جاتے تب حضرت چارپائی پر بیٹھ جاتے۔ (۱۵)

یہ تو براہِ راست مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کا معاملہ تھا، اب مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری نسل یعنی حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادگان مولانا قاری محمد طیب اور مولانا محمد طاہر کے ساتھ رویہ دیکھئے! قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: جب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند ورود فرمایا تو حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ: حضرت! ان دونوں بچوں (محمد طیب اور محمد طاہر) کو بیعت فرمالیجیے! تو از راہِ تفنن فرمایا:

''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار ہے۔ دو بزرگوں (حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ) کے دو ہی صاحبزادے ہیں (مولانا مسعود احمد گنگوہیؒ اور حافظ احمد صاحبؒ) اس نے دونوں پر پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا ہے، اب اگر ان بچوں کو بھی بیعت کرلیا تو کہیں گے کہ دیکھو اس نے آگے کو بھی قبضہ رکھنے کو داغ بیل ڈال دی ہے۔ دو دن کے بعد اچانک خود ہی دارالعلوم تشریف لاکر مجھے اور طاہر مرحوم کو بلایا، ہمارے ذہن میں بھی نہیں رہا تھا کہ ہمیں بیعت بھی ہونا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت کیوں یاد فرمایا؟ فرمایا: مرید کرنا ہے۔ اس وقت ندامت سی ہوئی کہ اس کے لیے ہمیں خود حاضر ہونا تھا، لیکن یہاں قصہ برعکس ہو رہا ہے''۔ (۱۶)

استاذ کی اولاد کی اولاد کے حق اور خدمت کا ایک اور محیر العقول واقعہ دیکھیے جو اپنے تأثر میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جب قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رشتہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایما وحکم پر رام پور کے ایک

باعزت و دین دار گھرانے میں طے ہوا تو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی امنگ اور جوشِ مسرت سے فرمایا کہ بھائی! یہ رشتہ میں لے کر جاؤں گا۔ چنانچہ یہ پیغام خود ہی لے کر رام پور تشریف لے گئے اور وہاں جا کر فرمایا:

''میں اس وقت حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھرانے کے ایک ڈوم اور حجام کی حیثیت سے رشتے کا پیامی بن کر آیا ہوں۔'' (۱۷)

میں مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کی خادمہ کا غلام ہوں: شیخ الہندؒ

اسی طرح اپنے برادر اصغر مولانا محمد طاہر کے متعلق قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی راوی ہیں کہ:

''ایک مرتبہ مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا، نماز کے لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس سے سب لوگ اٹھ کر چلے، میرے برادر خورد مولوی طاہر مرحوم ٹھہر گئے۔ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ اندر زنانہ مکان سے گرم پانی لائے اور مولوی طاہر مرحوم سے فرمایا کہ: وضو کرلو، وہ ذرا ہچکچائے کہ حضرت میرے لیے لوٹا لائے، اس پر فرمایا کہ: تم جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ میں پیرو کا غلام ہوں۔ (پیرو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں خادمہ تھیں)۔ (۱۸)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: بہ صد گریہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ کے جوتے سر پر رکھنا

پے بہ پے خدمت، عظمت و تعلق اور اس خادمانہ پاس ولحاظ کے باوصف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اس بات پر نادم اور شرمندہ رہے کہ انہوں نے مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے احسانات کا حق ادا نہیں فرمایا۔ چنانچہ سفرِ حجاز کے لیے روانہ ہوتے وقت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر حاضر ہوئے، مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ کی خدمت میں عرض کیا:

''اماں جی! آپ کی کوئی خدمت نہیں کی، بہت شرمندہ ہوں، اب سفر میں جا رہا ہوں، ذرا اپنا جوتہ دے دیجیے، انہوں نے پس پردہ سے جوتا آگے بڑھا دیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو لے کر اپنے سر پر رکھا اور روتے رہے کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرما دیجیے''۔ (۱۹)

مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ و مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادگان سے اصرار: کہہ دو! یہ ناکارہ ہمارا خادم ہی رہا

چلیے! یہ تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ تھیں، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ماں کے مثل تھیں، ان کے رو بہ رو یہ عاجزی اور ندامت قابل فہم بھی ہے، لیکن مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حافظ محمد احمد صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعودؒ کے بالمقابل بھی شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

کی عاجزی اور ندامت کا یہی عالم تھا۔ جب کہ حافظ صاحبؒ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور حکیم صاحبؒ مرید۔ مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ:

''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مالٹا سے آنے کے بعد حضرت کی مردانہ نشست کے سامنے کے کمرے میں بند کواڑ کھول کر میں اچانک اندر گھسا تو یہ منظر دیکھا کہ دونوں مخدوم زادے ابن قاسم حضرت حافظ اور ابن رشید حضرت حکیم مسعود احمد صاحب گنگوہی تخت پر ہیں اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تخت سے نیچے ان دونوں کے سامنے مؤدب بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں اور ہاتھ جوڑے ہوئے انتہائی نیازمندی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ دونوں کا کوئی حق واجب ادا نہیں کیا، اب میرے مرنے کا وقت ہے اور دونوں بزرگوں (حضرت قاسمؒ اور حضرت گنگوہیؒ) کو منہ دکھانا ہے تو میں انہیں ان کے صاحبزادوں کے بارے میں کیا جواب دوں گا؟ تم دونوں کوئی کلمہ تسلی کا میرے لیے کہہ دو کہ میں وہی کلمہ ان بزرگوں کے سامنے کہہ دوں اور قیامت کے دن یہ بزرگ خود تم سے کچھ پوچھیں تو تم بھی کلمۂ خیر کہنا کہ یہ ناکارہ خادم ہمارا خادم ہی رہا اور ہم سے الگ نہیں ہوا۔''(۲۰)

یہی وہ اوصاف تھے جس نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو جاودانی بخشی تھی۔ اپنے شاگرد اور مرید کے روبہ رو ہاتھ جوڑ کر وہی شخص بیٹھ سکتا ہے جو مقام احسانی کو پاچکا ہو۔ یہ بے نفسی اور فنائیت عظیم مجاہدات اور سینکڑوں کرامات سے بلند اور بیش قیمت ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: جانور سے اُنس

عشق ومحبت کے خمیر سے پروان چڑھنے والے ہی معرفت اور احسان کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کے دل میں انسان تو انسان جانور تک کے لیے جذبۂ ترحم بیدار رہتا ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن بجنوریؒ لکھتے ہیں:

''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی عادت شریفہ تھی کہ ہر سال قربانی کے لیے بچھڑا خریدا کرتے تھے۔ سال بھر تک اس کی خوب خاطر کرتے اور اپنی اولاد کی طرح رکھتے تھے۔ ایک دفعہ جو بچھڑا خریدا وہ آپ سے بہت زیادہ مانوس ہوگیا۔ حضرت جب دارالحدیث درس دینے کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ بچھڑا بھی ہمراہ جاتا اور دارالحدیث کے باہر بیٹھ جاتا۔ جب آپ سبق سے واپس ہوتے تو بچھڑا بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس ہوتا۔ لیکن جب قربانی کا دن آیا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تعمیل حکم خداوندی میں خود اپنے دست مبارک سے اس کو ذبح کیا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت کی یہ حالت تھی کہ ہاتھ سے چھری چلا رہے تھے اور آنکھوں سے اشک ریزاں تھے۔''(۲۱)

اور یہ صرف ایک دفعہ ہی کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ مولانا محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق

یہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ وہ جانور خود پالتے، اسے خود چارہ کھلاتے، ایام قربانی جب قریب ہو جاتے تو گھاس میں کمی کر دیتے اور بالٹی بھر کر دودھ جلیبی کھلاتے، پھر قربانی سے پہلے اس کے جگہ جگہ مہندی لگاتے اور پھر یوم نحر (۱۰ ذوالحجہ) کو قربان کرکے ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ'' پر عمل کرتے۔''(۲۲)

وعظ اَللہ کے لیے نہ کہ اظہارِ علم کی غرض سے

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جس زمانے میں جامع العلوم کان پور میں مدرس تھے، وہاں جلسہ دستار بندی میں شرکت کی درخواست کے لیے اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کو دیوبند خط لکھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سادگی کا حال یہ تھا کہ آپ کے پاس صرف ایک کرتا، ایک پاجامہ، ایک ٹوپی اور ایک لنگی تھی۔ آپ کے کپڑے کھدر کے ہوتے، ہاتھ سے دھوئے جاتے اور انہیں استعمال کیا جاتا۔ چوں کہ کان پور میں دیگر مکتب خیال کے علما اور اہل علم سے ملاقات ونشست کا احتمال تھا، اس لیے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو خاص طور پر لکھا:

> ''حضرت! میں ایک بات عرض کرتا ہوں، ہے تو حماقت جو میں عرض کرتا ہوں، مگر بڑے چھوٹوں کی بے وقوفی کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ حضرت! آپ ذرا دھلے ہوئے کپڑے پہن کر تشریف لاویں..... حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: تمہارے خط کی رعایت کی جائے گی۔''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سب لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ میرے استاذ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے تشریف لانے والے ہیں، جو اتنے اتنے کمالات کے جامع ہیں۔ جب ان حضرات کو آمد کی اطلاع پہنچی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کو لینے کے لیے اسٹیشن گئے، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ایک لنگی کندھے پر تھی اور جو کان پور کے علماء تھے وہ بڑے بڑے جبے پہنے ہوئے تھے، یہاں ان کو کوئی صورت سے بھی نہیں پہچانتا تھا کہ یہ کوئی چار حرف بھی جانتے ہوں گے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ وتقریر کی درخواست کی، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''میں اور وعظ! کیا تمہاری بھد نہیں ہوگی کہ ایسے کے شاگرد ہیں، جن کو بولنا بھی نہیں آتا۔ تمہارا وعظ تو، ماشاء اللہ! وعظ ہوتا ہے''۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا: نہیں! نہیں! آپ وعظ فرمائیں، فرمایا:

> ''اچھی بات ہے، وعظ کہوں گا، تاکہ سامعین کو معلوم ہو جائے کہ شاگرد استاذ سے بڑھا ہوا ہے۔''(۲۳)

وعظ شروع فرمایا، جس میں فقہ کے مسائل خوب بیان فرمائے۔ علمائے کان پور یہ سمجھتے تھے کہ

دیوبند اور سہارن پور کے علماء معقولات نہیں جانتے، فقہ خوب جانتے ہیں۔ اسی اثناء میں مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھیؒ تشریف لے آئے۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نفس کشی کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے، جہاں کوئی ایسا موقع آیا جس سے نفس کو حظ اٹھانے کا موقع ملے یا کوئی ایسی بات ہو جس سے اپنی بڑائی یا عظمت جھلکتی ہو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت نفس کشی کا سامان مہیا کر لیتے تھے، ان کی ذات وقتی تأثرات وجذبات سے بالکل غیر متأثر اور لاتعلق ہوچکی تھی۔ مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی آمد اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی للّٰہیت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جناب مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ بھی کان پور تشریف لائے ہوئے تھے، میرے عرض کرنے پر جلسے میں تشریف لائے اور عین اثنائے وعظ میں تشریف لائے۔ اس وقت ایک بڑا عالی مضمون بیان ہورہا تھا جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم لوگ خوش ہوئے کہ ہمارے اکابر کی نسبت معقولات میں مہارت کم ہونے کا شبہ آج جاتا رہے گا اور سب دیکھ لیں گے کہ معقول کس کو کہتے ہیں۔ مولاناؒ کی جوں ہی مولانا علی گڑھی رحمۃ اللہ علیہ پر نظر پڑی فوراً وعظ بیچ ہی میں سے قطع کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بہ وجہ ہم درس ہونے کے بے تکلف تھے، انہوں نے دوسرے وقت عرض کیا کہ یہ کیا کیا؟ یہی تو وقت تھا بیان کا۔ فرمایا: ہاں! یہی خیال مجھ کو آیا تھا، اس لیے قطع کردیا کہ یہ تو اظہارِ علم کے لیے بیان ہوا، نہ کہ اللہ کے واسطے۔'' (۲۴)

ترجمۂ قرآن کی اشاعت کے لیے تلامذہ کی تصدیق، بے مثل عاجزی

مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ تو پھر معاصر، ذی علم اور صاحب نسبت بزرگ تھے، ان کے روبہ رو تواضع کا اختیار کرنا اتنا حیران کن نہیں جتنا اپنے تلامذہ کے سامنے تواضع کا واقعتی اظہار موجبِ حیرت معلوم ہوتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

> ''جب حضرتؒ نے قرآن پاک کا ترجمہ پورا کیا، تو حضرتؒ نے دیوبند میں سب علماء کو جمع کر کے- جو حضرت کے خدام اور تلامذہ تھے- یہ فرمایا کہ: بھائی! میں نے قرآن شریف کا ترجمہ پورا تو کر دیا ہے، لیکن سب مل کر اس کو دیکھ لو، اگر پسند ہو تو شائع کرو، ورنہ رہنے دیا جائے۔'' (۲۵)

بلاشک بے نفسی، للّٰہیت اور تقویٰ کا یہ مقام عارفین کو بھی بہت آخر میں جا کر نصیب ہوتا ہے اور اس کا حصول انسان کو ہر ہر لمحہ اپنے احتساب اور محاسبے میں مشغول اور متوجہ رکھتا ہے۔

شیخ الہندؒ: انگریزوں کے متعلق استفتا کا جواب لکھنے سے اعراض، نفرت کلیدی وجہ

ایسے متقی اور باصفا انسان کا کوئی کام جذبات یا غصے سے مغلوب ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انگریز

جس سے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نفرت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، تحریکِ خلافت کے دوران جب ترکِ موالات کے بارے میں حضرتؒ سے استفتا کیا گیا تو اپنے محبوب ترین شاگردوں (مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کو بلا کر فرمایا:

''بھائی! یہ استفتا آیا ہے، میں چاہتا ہوں اس کا جواب آپ لکھ دیں، کیوں کہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ: ''وَ لَایَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔'' (اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف کے خلاف کچھ کہو، عدل کرو کہ وہی تقویٰ کے قریب تر ہے) اور مجھے انگریزوں سے جس درجے عداوت وبغض ہے اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے، کہیں میں ان کے بارے میں خلافِ انصاف کوئی بات نہ لکھ جاؤں۔''(۲۶)

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ: تکفیر مسلم سے احتراز کا نمونہ

جو انسان اپنے بدترین دشمن کے متعلق حکم لگانے میں اس درجے محتاط ہو وہ حلقۂ یاراں کے لیے کیوں ریشم کی طرح نرم نہ ہوگا۔ اسی احتیاط کی ایک مثال دیکھیے! مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، اہل بدعت نے اس کا جورَ دلکھا، اس میں انہیں کافر قرار دیا، اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغ را جزا باشد دروغے

ترجمہ: ''تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیوں کہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔''

انہوں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر سنائے تو آپؒ نے شعر کی لطافت کی تعریف فرمائی، لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ تم نے لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا، حالاں کہ فتوے کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں، اس لیے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
وہم شکر بجائے تلخ دروغے

اگر تو مومنی فبہا والا

دروغے را جزا باشد دروغے (۲۷)

ترجمہ: ''تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں، کیوں کہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا۔ اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر، ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے۔''

حوالہ جات

۱:......اشرف علی تھانویؒ، ملفوظات حکیم الامتؒ، ملتان: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ۱۴۳۰ھ، جلد: ۳، صفحہ: ۱۲۷، ملفوظ: ۱۹۳۔

۲:......سلیمان بن احمد الطبرانیؒ، المعجم الأوسط، قاہرہ، دارالحرمین، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء، باب المیم، من اسمہ محمد، محمد بن عثمان بن أبی شیبۃ، جلد: ۵، صفحہ: ۳۵۶، رقم: ۵۵۴۱۔

۳:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ: ۱۵۰۔

۴:......حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، لاہور، مکتبہ محمودیہ، ۱۹۷۷ء، صفحہ: ۱۵۹۔

۵:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحہ: ۱۶۸۔

۶:......حسین احمد مدنیؒ، سفرنامہ شیخ الہندؒ، صفحہ: ۱۵۹۔

۷:......قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام (مرتب: محمد عمران قاسمی بگیانوی)، مردان، مکتبۃ الاحرار، ۲۰۱۱ء، جلد: ۷، صفحہ: ۴۲۲۔

۸:......ایضاً، صفحات: ۴۲۲-۴۲۳۔

۹:......ایضاً، صفحہ: ۴۲۳۔

۱۰:......ایضاً، صفحہ: ۴۲۴-۴۲۵۔

۱۱:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد: ۱، صفحات: ۱۰۶-۱۰۷، قسط اوّل۔

۱۲:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرہ مشائخ دیوبند، بجنور، زرین کتب خانہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ: ۲۰۲۔

۱۳:......قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد: ۷، صفحات: ۴۲۶-۴۲۷۔

۱۴:......ایضاً، صفحہ: ۴۳۹۔

۱۵:......ایضاً، صفحہ: ۴۳۹-۴۴۰۔

۱۶:......ایضاً، صفحہ: ۴۲۱-۴۲۲۔

۱۷:......ایضاً، صفحہ: ۴۲۶۔

۱۸:......محمد زکریا سہارنپوریؒ، آپ بیتی، صفحہ: ۹۵۴۔

۱۹:......ایضاً۔

۲۰:......قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد: ۷، صفحہ: ۴۴۰۔

۲۱:......عزیز الرحمٰن بجنوریؒ، تذکرۂ شیخ الہندؒ، صفحات: ۱۶۸-۱۶۹۔

۲۲:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد: ۱، صفحات: ۱۰۵-۱۰۶، قسط: ۴۔

۲۳:......محمود حسن گنگوہیؒ، ملفوظات فقیہ الامت، جلد: ۱، صفحات: ۴۲-۴۳، قسط: ۵۔

۲۴:......اشرف علی تھانویؒ، ''ذکر محمودؒ''، مشمولہ تذکرہ شیخ الہندؒ، صفحہ: ۵۳۰۔

۲۵:......محمد زکریا سہارنپوریؒ، آپ بیتی، جلد: ۲، صفحہ: ۹۵۰۔

۲۶:......قاری محمد طیبؒ، ''پچاس مثالی شخصیات''، مشمولہ مجموعہ رسائل حکیم الاسلام، جلد: ۷، صفحات: ۴۲۷-۴۲۸۔

۲۷:......محمد تقی عثمانی، اکابر دیوبند کیا تھے؟، کراچی: ادارۃ المعارف، ۲۰۰۳ء، صفحہ: ۲۳۔

(جاری ہے)